تو اب سنئے کہ جب ہمارا جہاز جہلم کے نزدیک پہنچا تو اعلان ہوا کہ اسلام آباد کا موسم خراب ہے۔ ہم واپس لاہور چلتے ہیں۔ لیجئے ہم جاتے جاتے واپس آ گئے۔ ائیر پورٹ دو گھنٹہ انتظار کیا۔ پھر جہاز چلا لیکن ابھی رن وے ہی پر تھا کہ اعلان ہوا کہ موسم اچھا ہو کر پھر خراب ہو گیا۔ مسافر لاؤنج میں جائیں اور مزید انتظار کریں۔

میں نے کشور سے کہا کہ یہ اچھا شگن نہیں ہے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں کہ ہم جرنیل صاحب کے حضور پیش ہوں۔ اب ہم تیسری بار بھی جہاز میں بیٹھے اور وہاں جانے پر مصر ہوئے تو قدرت ہم سے خفا بھی ہو سکتی ہے۔ تو آؤ واپس گھر چلتے ہیں۔ سو ہم گھر چلے آئے۔

دوسرے دن وہاں پیشی بھگتنے والوں نے بتایا کہ اچھا ہی ہوا تم نہیں پہنچے۔ وہاں روحی بانو والا ٹوٹا بطور خاص دکھایا گیا تھا۔ جرنیل صاحب نے پوچھا ''اس سین کی منظوری کس نے دی تھی۔''

بورڈ کے افسروں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''بورڈ میں دو ادیب ہیں۔ انہوں نے اسے پاس کرنے پر زور دیا تھا۔''

''وہ کون ادیب تھے۔'' جرنیل صاحب نے غصے سے پوچھا۔

''کشور ناہید اور انتظار حسین۔''

''کہاں ہیں وہ۔''

''موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا اس لیے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے۔''

فلم سنسر بورڈ کی ایک سے زیادہ باریاں میں نے بھگتائیں۔ مگر اب دھیان کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مسلسل ایک ہی فلم دیکھتا رہا ہوں۔ ایک اردو کی فلم ایک پنجابی کی فلم۔ وہی ایک کہانی' وہی یکساں کردار' یکساں سچوایشنز اور اداکار بھی ہر پھر کر وہی۔ اردو فلم میں یہ لازم ٹھہرا تھا کہ ہیروئن کسی نہ کسی مرحلہ میں کوٹھے پہ ضرور پہنچے گی اور بحالت مجبوری پیروں میں گھنگھرو باندھ کر ناچے گی بھی۔ اور پنجابی فلموں میں ہیرو کے لیے لازم تھا کہ آٹھ دس دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ ان فلموں کو دیکھ دیکھ کر جی اتنا بھر گیا کہ اب کسی پاکستانی فلم کو دیکھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔

جرنیل صاحب کے دور کی کس کس بات کر یاد کیا جائے۔ مگر بے نظیر بھٹو کے پہلے دور کی تو ایک بات کے سوا کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی۔ بس اس دور کے شروع ہوتے ہی ہمارے ادیبوں دانشوروں کی دنیا میں مزاحمتی ادب کا غلغلہ بلند ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ میرے سوا باقی سارے ہی لکھنے والے مزاحمتی ادب رقم کرتے رہے تھے۔ اور اب اس کا اجر ملنے کا وقت آ گیا تھا۔ سو جسے دیکھو اپنے رقم کردہ مزاحمتی ادب کو بغل میں دابے اسلام آباد کی طرف رواں دواں ہے۔ اور قسمت والوں کو اجر ملا بھی۔ بس یوں سمجھئے کہ جرنیل صاحب کا

دور محب وطن ادیبوں کا دور تھا۔ اب مزاحمتی ادیبوں کا زمانہ شروع تھا۔ مگر ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ ختم بھی ہو گیا

''جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا''

پھر محب وطن ادیبوں کی چہل پہل شروع ہو گئی۔

خیر یہ زمانہ بھی مختصر رہا۔ جلد اس کی بساط لپٹ گئی۔ پھر پی پی کی حکومت آ گئی اور پھر مزاحمتی ادب کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ سو اب کے وقت ضائع نہیں کیا گیا۔ فوراً ہی کام شروع ہو گیا۔

مجھے اس وقت کے ٹی وی سٹیشن پر برپا ہونے والا ایک جلسہ یاد آ رہا ہے۔ شہر کے سارے ادیبوں دانشوروں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ اسلام آباد سے اسلم اظہر آئے بیٹھے تھے اور مشورہ طلب کر رہے تھے کہ ٹی وی کے پروگراموں میں نئے تقاضوں کے تحت کیا تبدیلیاں لائی جائیں۔ بس انقلابی دانشور شروع ہو گئے۔ ایک تقریر۔ دوسری تقریر۔ تیسری تقریر۔ سب تقریروں کا مضمون ایک ہی تھا کہ غیر انقلابی دانشوروں نے بہت گلچھرے اڑا لیے۔ اب ٹی وی پر ان کا داخلہ بند ہونا چاہیے۔ سارے پروگرام فوراً انقلابی سانچے میں ڈھل جانے چاہئیں۔ ویسے تو اس جلسہ میں اشفاق احمد بھی موجود تھے۔ مگر آج وہ کہیں پچھلی صف میں بیٹھے تھے اور گونگے کا گڑ کھا کر یہاں آئے تھے۔

''بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے''

ہاں اس کے بعد وہ ایسے کسی اجتماع میں نہیں دیکھے گئے۔ حقیقت پسندانہ بات یہاں شاید محمود ندیم نے کہی۔ کہا کہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ انقلاب آ گیا ہے۔ انقلاب نہیں آیا ہے۔ بس استحصال کی فصیل میں ایک دراڑ پڑی ہے۔ مگر یار پھر بھی اپنی اسی رو میں بولتے رہے۔ انقلاب اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی آ چکا تھا۔ پی پی کے پہلے اور دوسرے دور میں تو احمد فراز یہاں چیئرمین بنے ہوئے تھے۔ احمد فراز شاعر' مولا دولا قسم کے آدمی۔ کسی کام کے سلسلہ میں تردد کے قائل نہیں۔ مگر اب فخر زمان چیئرمین بن کر آئے تھے۔ فوراً ہی متحرک ہو گئے۔ لاہور وارد ہوئے اور فوراً ادیبوں دانشوروں کو ایک بڑے ہوٹل میں اکٹھا کیا۔ اپنے انقلابی منصوبے بتائے۔ ہم خیالوں سے مشورے مانگے۔ اور پھر اسی نہج پر تقریریں شروع ہو گئیں کہ جیسے سچ مچ انقلاب آ گیا ہے۔

اسی دوران کشور ناہید نے جلسہ میں قدم رکھا۔ وہ اسلام آباد سے آ رہی تھیں۔ باری باری لاہور کے دوستوں کے پاس جاتی تھیں اور کانا پھوسی کرتی تھیں کہ کم بختو تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔

جب وہ سب دوستوں کو کچوکے دے کر اطمینان سے ایک گوشے میں جا بیٹھیں تو ایک کمبخت نے دوسرے کمبخت سے سرگوشی میں

کہا کہ ہم تو سچ مچ کمبخت ہیں کہ لینے میں نہ دینے میں مگر یہاں پہ آئے بیٹھے ہیں۔ مگر یہ کمبخت خود کیوں آئی ہے۔

دوسرا کمبخت بولا ''تمہیں پتہ نہیں۔ اسے اب پاکستان نیشنل آف آرٹس کا انتظام سنبھالنا ہے۔''

تقریریں ہو رہی تھیں اور لمبے چوڑے انقلابی منصوبے پیش کیے جا رہے تھے۔ تب افضل رندھاوا نے جھرجھری لی۔ اور کہا کہ یہ سب منصوبے برحق۔ مگر ایک بات میں کہتا ہوں۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ جو کرنا ہے جلدی کر لو۔

مگر یاروں نے یہ بات ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ فوراً ہی ایک طویل المیعاد منصوبہ پیش ہوا۔ کہا گیا کہ پاکستان کی تاریخیں اب تک جو لکھی گئی ہیں سب غلط ہیں۔ پاکستان کی تاریخ از سر نو لکھی جانی چاہیے۔ سو فوراً ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ بتایا گیا کہ پہلے یہ دانشور تحقیق کر کے مواد اکٹھا کریں گے۔ پھر مختلف جلدوں میں یہ تاریخ ایک انقلابی نقطہ نظر سے رقم کی جائے گی۔

''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں''

بس اس کے فوراً بعد اکیڈیمی کے ملک گیر ادبی اجتماع کا غلغلہ بلند ہوا۔ ضیاء الحق کے زمانے کے ادیبوں کا میلہ کانوں سنا تھا۔ یہ میلہ اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا۔ پی پی کے جیالے موج در موج امڈے ہوئے تھے۔ انہیں میں رلے ملے سینکڑوں گمنام اور نامور ادیب بھی تھے۔

ویسے تو اس میلہ کا ایک بین الاقوامی اڈیشن بھی تھوڑے عرصے کے بعد آیا تھا۔ مگر میں نے ایک ہی میلہ پر قناعت کی۔

تابڑ توڑ نشستیں ہوئیں۔ ہر نشست میں مقالے اور تقریریں۔ مگر مجھے تو ایک ہی تقریر یاد رہ گئی ہے۔ ہاں اس سے پہلے بھی ایک تقریر ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ سندھ سے یہاں سندھی ادیب بھی آئے بیٹھے تھے اور مہاجر ادیب بھی۔ سندھی ادیب اپنی باری لے چکے تھے۔ اب مہاجر ادیب اپنی باری لینے کے لیے آستینیں چڑھا رہے تھے۔ منتظمین نے ایک عقلمندی کی کہ بیچ میں کرار صاحب کو کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ایسی تقریر کی کہ دونوں طرف جو آگ لگی ہوئی تھی وہ ٹھنڈی ہو گئی۔

اور اب ڈاکٹر مہدی حسن کو سنو۔ حسب دستور بہت جوش میں بول رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے حضرت علی کا ایک قول نقل کیا کہ لوگو! ڈرو اس شخص سے جس کے دونوں ہاتھ خالی ہوں۔ اور مہدی حسن نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے ''لوگو دیکھ لو۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔''

مگر جیالے ذرا جوڑ رے ہوں۔ ہاں یہ سبق لیا کہ انقلاب برحق مگر آدمی کے دونوں ہاتھ خالی نہیں رہنے چاہئیں۔

یہ دور بھی ہوا کا جھونکا نکلا کہ ادھر آیا ادھر گیا۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

اور اب کے تو ایسے گئے کہ ساتھ میں وہ جوان کا ایک رعب داب تھا وہ بھی چلا گیا۔ دونوں ہاتھ کسی کے خالی ہوتے تو اغیار ڈرتے۔ اب وہاں ڈرنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔

◆◆◆

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

کتنے برسوں بعد کل رات میں پھر اسی ٹولنٹن والے نکڑ پر کھڑا تھا۔ رات کے سفر کی واپسی میں ہمارا آخری پڑاؤ۔ یہاں آ کر ہذا فراق بینی و بینکم کا مضمون شروع ہوتا مگر اس وقت میں اکیلا ہوں۔ سواری کی تلاش ہے۔ اردگرد دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ دن کے بھیڑ بھڑ کے میں ادھر سے گزرتے ہوئے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ رستہ اب کس حال میں ہے۔ اب جو ذرا رات بھیگنے لگی ہے اور بھیڑ بھڑ کا کم ہوا ہے تو خالی رستہ بول رہا ہے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کا ان گنت دروں والا لمبا پتلا برآمدہ کیا تھا' اب کیا ہے۔ اور برآمدے کے آخری در میں جو ایک بوڑھا پنواڑی ایک دھیمی لو والے چراغ کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا' وہ کدھر گیا اور وہ ڈھائی تین تانگے جوان گھڑیوں میں یہاں سستایا کرتے تھے اور ساتھ میں سواری کا انتظار بھی کرتے رہتے' وہ کیسے غائب ہو گئے۔ رکشائیں تو یہاں ان دنوں نظر نہیں آتی تھیں اور ہاں وہ جو سامنے والے نکڑ پر گلے میں مفلر لپیٹے چھڑی کے سہارے کھڑے مولانا حالی نظر آیا کرتے تھے مگر خیر وہ تو صرف ناصر کو نظر آتے تھے۔

رات کی ان خاموش' مطلب یہ کہ نسبتاً خاموش گھڑیوں میں (ورنہ خاموشی تو جیسے اس نگر سے رخصت ہو چکی ہے) یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا پورا رستہ جیسے مجھ سے کچھ پوچھ رہا ہے' اسے پوچھنا بھی چاہیے کہ کتنوں برسوں سے اس نے ان قدموں کی آہٹ نہیں سنی جن سے وہ اپنی سنا ہٹی راتوں کے بیچ رفتہ رفتہ کتنا مانوس ہو گیا تھا مگر مجھے بھی تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے اپنے نشانات کو کہاں گم کر دیا۔ فٹ پاتھ پر جہاں تہاں چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھے ہوئے پان سگریٹ والے کس کھوہ میں جا چھپے اور وہ جو اس کے دائیں بائیں منور چائے خانے تھے' وہ کدھر گئے۔ کافی ہاؤس' چینیز' ڈین' گرڈینیا' بلیو رستوران' سٹینڈرڈ' شیراز' کیفے اورینٹ' سٹفلز' لارڈز' میٹرو سب ہی حرف مکرر کی مثال مٹ گئے تھے جیسے ایک پوری تہذیب تھی کہ غروب ہو گئی۔

چیخوف نے اپنے بھائی کو خط لکھتے ہوئے اس کی ادبی کاوشوں پر بہت سی باتیں کیں۔ آخر میں لکھا کہ ''میں تمہیں یہ باتیں کچھ اس وجہ سے بھی لکھ رہا ہوں کہ تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ تم اکیلے ہو۔ تخلیقی سرگرمی میں تنہائی بہت دکھ دیتی ہے۔''

ٹھیک کہا مگر ایک بات گوتم بدھ نے بھی کہہ رکھی ہے اگر اپنے سے بہتر یا کم از کم اپنے برابر کا سنگھی نہ ملے تو پھر یاتری کو چاہیے کہ ہمت سے قدم اٹھائے اور اکیلا یاترا کرے کہ مورکھ کے ساتھ تو سنگت ہو نہیں سکتی۔''

خیر میں نے تو اچھی سنگت ہی میں یاترا شروع کی تھی۔ لاہور آ کر بھی یہ ہوا کہ جب میں نے یہاں آ کر ڈیرا کیا تو سنگھی ساتھی ملتے ہی چلے گئے۔ میں اپنے شروع کے دنوں کو دھیان میں لاتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں یہ سوچ کر کہ اس شہر کی تپتی دوپہریں اور سناہٹی راتیں ان دنوں تخلیق کے درد سے کتنی دھڑکتی نظر آتی تھیں۔ سنگھی ان دنوں کتنے تھے۔ ہر ایک کی دیوانگی کا اپنا طور تھا۔ شب زندہ دار ناصر کاظمی، گم سم شاکر علی، علم کے بوجھ سے بھاری مظفر علی سید، فلسفہ اگلتے شیخ صلاح الدین، انگلی سے ہوا میں عورت کا پیکر تراشنے میں منہمک حنیف رامے ایڈورٹائزنگ کے وظیفہ میں غرق سعید محمود، ٹی ہاؤس کے ساتھ چپکے ہوئے شہرت بخاری اور احمد مشتاق۔ اس وقت یہی لگتا تھا کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ یہ اپنی وضع کے پکے اور اپنی دیوانگی میں سچے نہ اپنے تکیے سے اٹھیں گے، نہ اپنی دیوانگی چھوڑیں گے۔

مگر زمانے کو قرار کہاں۔ ہر صحبت آخر کے تئیں صحبت چند روزہ ثابت ہوتی ہے۔ چار گھڑی یاروں کا میلہ، پھر خاموشی۔ یاروں کی منڈلی بکھرتی چلی گئی۔ اردگرد قریب و دور نظر دوڑاتا ہوں، مشکل سے کوئی نظر آتا ہے۔

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

خیر ساتھ کے جو بیمار جان سے گزر گئے، ان کا جانا تو قضا کی طرف سے ٹھہر گیا تھا۔ باقیوں کو کیا ہوا، کوئی گوشہ نشین ہوا، کسی کو زمانے کی ہوا اڑا کر پردیس لے گئی۔ کسی کو سیاست کا بھیڑیا منہ میں دبا کر لے گیا۔ کوئی لقمہ ملازمت بن گیا۔ بیماروں نے کس کس راستے آزار سے چھٹکارا حاصل کیا۔

کتنی دفعہ گمان ہوا کہ میں اپنے آزار کے ساتھ اکیلا رہ گیا ہوں۔ مورکھوں کے ساتھ سنگت ہو نہیں سکتی تھی۔ خیر جوئندہ یابندہ، کچھ نئے بیمار نظر آئے۔ سوچا کہ انہیں سے رشتہ استوار کروں مگر کوئی بیمار، دوسرے بیمار کا بدل نہیں ہو سکتا۔ پھر یوں بھی ہے کہ آدمی کو اپنی پہلی محبت بہت عزیز ہوتی ہے۔ بعد میں دل پر جتنے بھی وار ہوں، گمان یہی رہتا ہے کہ وہ جو ہم نے شروع میں عشق کی چوٹ کھائی تھی، اسی نے ہمیں بنایا بگاڑا ہے تو مجھے بھی یہی گمان رہتا ہے کہ میں نے بہت خوشبو دیوانگی کی انہیں جاگتی راتوں اور تپتی دوپہروں سے اڑائی ہے جو بیت چکی ہیں اور ان دیوانوں سے جو ان راتوں اور دوپہروں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور احساس ہے کہ شاید پاکستان کی بہترین راتیں اور بہترین دوپہریں وہی تھیں۔ پاکستان کی راتوں اور دوپہروں، صبحوں اور شاموں کا سنہری زمانہ کہہ لیجئے یعنی پاکستان کا سنہری زمانہ۔ کتنی جلدی یہ زمانہ گزر گیا۔ پھر ہماری راتیں پریشان اور دوپہریں اذیت ناک ہوتی

چلی گئیں اور صبحوں اور شاموں کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شاید دیوانگی کا دور بھی ختم ہو گیا کہ ایک ایک کر کے سب ہی غائب ہو گئے۔ جانے کس کھوہ میں جا چھپے۔ اب میں انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ ان کے سارے ٹھکانے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ حیران ہوں کہ وہ سب چائے خانے وہ شاداب ریستوران ایسے مٹے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ جیسے ایک تہذیب تھی کہ مٹ گئی چائے خانوں کا بند ہو جانا' تہذیبی اعتبار سے تو یہ کوئی اچھا شگن نہیں ہے۔ ہاں یاد آیا کہ مال روڈ کا ایک پوش ریستوران اب سے تھوڑے برسوں پہلے تک چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والوں کی ایک ٹولی کا ٹھکانا بنا ہوا تھا۔ حبیب جالب' اکا دکا صحافی' کوئی دانشور' کوئی نمبر 2 سیاستدان' بس بیٹھے ہیں' چائے پی رہے ہیں اور بحث کر رہے ہیں۔ ریستوران کے مالک و منیجر نے جب یہ دیکھا کہ یہ ٹولی نہ لنچ کا آرڈر دیتی ہے' نہ ڈنر کا تکلف کرتی ہے۔ خالی چائے اور لمبی نشست۔ اس نے ریستوران میں نیا دستور نافذ کیا کہ خالی چائے سرو نہیں ہو گی۔ صرف لنچ اور ڈنر کا آرڈر والوں کو سرو کیا جائے گا۔ لیجئے مال پر جو یاروں کا آخری ٹھکانہ تھا' وہ بھی گیا۔ غالب نے یہ بلاوجہ نہیں کہا تھا کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

بے شک جیسا کہ ہمارے مصلحین کہہ گئے ہیں قوموں کی ترقی کا راز ذوق عمل میں پوشیدہ ہے لیکن ذوق عمل اس انتہا تک تو نہیں جانا چاہیے کہ فرصت کے رات دن بالکل ہی غائب ہو جائیں۔ علامہ اقبال برحق مگر ایک بڑی سچائی غالب کے بیان میں بھی پوشیدہ ہے۔ جوش عمل سے سرشار قوم کے بیچ ایسے ٹھالی ٹھسکے لوگ بھی تو ہونے چاہئیں کہ بس بیٹھے ہیں اور تصور جاناں میں غرق ہیں یا لیٹے ہوئے ستارے گن رہے ہیں اور کمر بند میں گرہیں لگاتے چلے جا رہے ہیں یا چائے خانے میں بیٹھے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا رہے ہیں اور بحث کر رہے ہیں' فلسفہ بگھار رہے ہیں یا پت جھڑ دیکھ رہے ہیں اور اداس بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی لوگ تو تہذیب کے ضامن ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے سے ایسے افراد کا غائب ہو جانا اور ان کے ٹھکانوں کا غارت ہو جانا اس معاشرے کے لیے کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ جب چائے خانے غائب ہو جائیں اور فاسٹ فوڈ ریستوران تیزی سے کھلتے چلے جائیں اور امنڈتا ہوا نیا ٹریفک گھاس اور پھولوں کے تختوں کو روند ڈالے اور درختوں کو نگلتا چلا جائے تو جان لیجئے کہ وہ روایتی شہر جس کی اپنی ایک تہذیب اپنی ایک بو باس ہوتی ہے' وہ رخصت ہوا اور اب ایک نئے شہر کی نمود اور ایک نئے کمرشل کلچر کی آمد آمد ہے۔

در بیان مشروبات و ماکولات

بارے شہر لاہور کی بوباس کا تھوڑا سا بیان ہو جائے۔ اس حوالے سے کہ اس روایتی شہر کے اپنے کھانے' اپنے ذائقے کیا تھے اور کس طرح بدلتے چلے گئے۔ اس کا احساس تو سب سے پہلے اپنے گھر ہی کے دسترخوان سے ہوا۔ میں بتا رہا تھا کہ میرے یہاں آنے کے بعد خاندان کے جو دو نگ یہاں پہنچے' وہ میرے دو بھانجے تھے۔ انصار اور منوں (حسن ظہیر) منوں ابھی تعلیم کے مراحل طے کر رہا تھا۔ انصار نے زندگی کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ شادی ہو چکی تھی۔ جو دلہن بیاہ کر لایا' وہ پنجاب کی مٹی تھی اور بٹالہ کی بیٹی۔ یہ ہمارے خاندان میں پنجاب کا پہلا نفوذ تھا' پھر تو یہ نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک روز کھانے کی میز پر شلجم گوشت کی ڈش دیکھ کر جی خوش ہوا مگر لقمہ منہ میں گیا تو جیسے گڑ منہ میں گھل گیا۔

''عائشہ یہ تم نے کیا پکایا ہے؟''

''ماموں! یہ گھونگھلو گوشت ہے۔''

''گھونگھلو گوشت تو ہے مگر میٹھا کیوں ہے؟''

''اے لو میٹھے کے بغیر بھی کہیں گھونگھلو گوشت پکتا ہے۔''

پھر کچھ شادیوں میں آنا جانا ہوا۔ شادی کا جو کھانا بھی کھایا' اس میں باقی کھانوں کے ساتھ پالک گوشت کی ڈش مقرر نظر آئی جیسے یہ شادی کے دسترخوان کا لازمی جزو ہے۔ اس ایک ڈش نے پنجاب کے ولیمہ کو یوپی والوں کے ولیمہ سے کتنا الگ ذائقہ دے دیا تھا۔

گرمیوں کے موسم میں ان دنوں دوپہر کو جس ریستوران میں بھی قدم رکھتے بیرا کھانے کا آرڈر بعد میں لیتا' پہلے نمکین لسی کا بھرا جگ لا کر میز پر رکھ دیتا۔

صبح کے ناشتے میں لاہور کے چٹورے حلوے پوری کی طرف لپکتے تھے یا سری پائے سیر ہو کر کھاتے تھے۔ ایک روز مظفر نے ذکر کیا کہ دلی کا ایک نہاری والا یہاں آیا ہے۔ لوہاری کے اندر ایک گلی میں اس نے اپنی دکان جمائی ہے۔ پھر فوراً ہی پروگرام طے کیا کہ کل صبح چل کر دیکھتے ہیں کہ کیسی نہاری بناتا ہے۔ لیجئے اگلی صبح منہ اندھیرے کہ ابھی چڑیوں نے چہکنا شروع کیا تھا ہم جاڑے میں کپکپاتے مارا مار کرتے گلی گلی جھانکتے لوہاری کی اس گلی میں پہنچے۔ نہاری کی دیگ دم میں آ چکی تھی۔ تندور پر نان لگ رہے تھے۔ اکا دکا گاہک بیٹھا تھا۔ ہم بھی جا شامل ہوئے۔ نہاری واہ واہ' نان سبحان اللہ۔ نان تو خیر لاہور والوں کی بھی غذا میں شامل ہے مگر دلی کے نان کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔ مظفر دلی کی زبان کے چٹخارے کا پہلے ہی قائل تھا' اب دلی کی نہاری کے ذائقہ کا بھی قائل ہو گیا۔ اس نے جانا کہ دلی کا یہ نہاری والا بھی میرا من دلی والے کا بھائی بند ہے۔ بس پھر ایک طور پر بندھ گیا کہ جاڑوں کے موسم میں تھوڑے تھوڑے

وقفہ کے بعد صبح سویرے منہ اندھیرے سوں سوں کی آوازیں نکالتے سٹ پٹ کرتے اس گلی میں پہنچتے اور سیر ہو کر نہاری کھاتے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' دلی والے کے گاہکوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ ہمیں وہاں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔

پاکستان کے وہ ابتدائی برس آئے گئے ہو گئے۔ اس زمانے کی بہت سی باتوں کے ساتھ یہ نہاری بھی میرے لیے بھول بسری چیز بن گئی۔ اچانک ایک دن نعیم طاہر کی طرف سے دعوت ملی کہ صبح ہمارے گھر آؤ۔ نہاری کا پروگرام ہے۔ میں وہاں پہنچا اور نعیم طاہر بتا رہے تھے کہ وہاں بہت لمبی قطار لگتی ہے۔ ہم رات ہی کو اپنا برتن قطار میں لگوا دیتے ہیں۔ صبح اذان کے وقت آدمی جاتا ہے اور نہاری لے کر آتا ہے۔ کیسی ہے۔ بہت لذیذ ہے۔ بے شک لذیذ تھی۔ وہی نہاری وہی نان لیکن اس وقت سے اب تک دلی والے کے گاہک بے تحاشا بڑھ گئے تھے اور پھر لوہاری کی اس گلی سے ایبٹ روڈ پر سید امتیاز علی تاج کی کوٹھی میں آتے آتے اور ڈائننگ ٹیبل پر سجتے سجتے ذائقہ میں تھوڑا فرق تو پڑنا ہی تھا۔ آئندہ چل کر اور فرق پڑنا تھا کہ شہر میں اب دلی کی نہاری قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ کھاتے پیتے لوگ ملازم کو منہ اندھیرے وہاں بھیج کر نہاری منگواتے' دوستوں کو ناشتے پر مدعو کرتے' دوست نہاری کھاتے اور ہونٹ چاٹتے۔

نہاری کا قبول عام یہ رنگ لایا کہ پھر لوہاری کی اس گلی کی قید نہیں رہی' نہ دلی کے نہاری والے کی شرط رہی۔ کھانے پینے کے جس بازار میں بھی جاؤ' منجملہ اور غذاؤں کے ایک دکان نہاری کی بھی نظر آنے لگی۔ پھر یہ ذائقہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی پہنچا اور مقبول ہوا۔ حق یہ ہے کہ پاکستان میں دلی کی دو ہی چیزیں چلیں یا دلی کی نہاری چلی یا جمیل الدین عالی چلے مگر نہاری تو مقبولیت کے اس نشہ میں اپنے ادب آداب ہی بھول گئی۔ نہار منہ سے اس کا جو لازمی رشتہ چلا آتا تھا' وہ غتر بوت ہو گیا۔ اب چٹوروں کے دستر خوان پر دوپہر جاؤ تو نہاری' رات جاؤ تو نہاری اور جب گلی گلی نہاری بک رہی ہو تو اس کا اپنا ذائقہ کہاں سلامت رہے گا مگر شعر و ادب ہو یا نہاری' مقبولیت کے بعد تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

تو تقسیم کے بعد لاہور شہر کے ذائقوں میں ایک انقلاب یہ آیا۔ خیر یہ کونسا ایسا انقلاب تھا۔ روایتی شہر کے ذائقوں کے بیچ ایک اور بڑے روایتی شہر سے آئے ہوئے ذائقے نے اپنی جگہ بنائی اور اس طرح بنائی کہ چٹورے اپنے سری پائے کو بھول گئے۔ ذائقوں میں انقلاب تو اب آیا ہے اور انقلاب سا انقلاب۔ نمکین لسی کا جگ ریستورانوں کی کھانے کی میزوں سے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ ٹیم اور سیون اپ کی بوتلیں نظر آتی ہیں۔ ان بوتلوں کی تہذیب کا آغاز کوکا کولا سے ہوا تھا۔ کوکا کولا چھٹی دہائی کے آغاز کے

ساتھ اس شہر میں داخل ہوا اور پورے شہر کو اپنی رو میں بہا کر لے گیا۔ یہاں تک کہ ستوؤں والوں نے اپنے ستوؤں کو ستو کولا کہہ کر اور شکر کا شربت بیچنے والوں نے اپنے شربت کو شکر کولا کہہ کر بیچنا شروع کر دیا۔ ایک نکڑ پر تخم بالنگے کا شربت بکا کرتا تھا۔ کولائی انقلاب کے بعد اس نے بھی ایک گتے پر تخم بالنگا کولا لکھ کر اپنے ریڑھے پر سجا لیا۔ انہیں دنوں پاکستان میں مصر کے جمال عبدالناصر کا دورہ ہوا۔ اس شہر میں بھی ان کا ورود ہوا۔ انجمن حمایت الاسلام کی تقریب میں پہنچے تو تواضع کرنے والوں نے فوراً کوکا کولا کی بوتل پیش کی۔ جمال ناصر نے کوکا کولا کی بوتل کو دیکھا۔ پھر پرے سرکا کر کہا کہ اپنے ملک کا کوئی مشروب پلایئے۔

مگر ملک کے مشروب تولسی سمیت سب ہی پس منظر میں چلے گئے تھے۔ جو بک رہے تھے' ان کے ساتھ بھی بیچنے والوں نے کولا کا لاحقہ لگا لیا تھا۔ صرف خالی پانی کی سبیل اس لاحقہ سے بچی رہ گئی تھی۔ آگے مال پر جہاں لارڈز تھا اور جہاں ہم وقت بے وقت براجا کرتے تھے' اس کے آس پاس ایک چارپائی پر ایک اپاہج بوڑھا لیٹا نظر آتا۔ جب مئی کا مہینہ آتا تو یہ چارپائی سرک کر فٹ پاتھ کے متصل آ جاتی اور فٹ پاتھ پر اس چارپائی کے آگے کورے مٹکوں کی ایک قطار نظر آتی۔ ٹھنڈے پانی سے بھرے مٹکے۔ آتے جاتوں کو یہ بوڑھا خود پانی پلاتا

''پانی پیو یہ نعمت رب جلیل ہے''

مگر شہر میں کوکا کولا کے سٹال پھیلتے جا رہے تھے۔ اس رو میں لسی ستو کولا' شکر کولا' تخم بالنگا کولا سب ہی بہہ گئے۔ ساتھ میں سبیل بھی بہہ گئی۔ بوڑھا مر گیا۔ اس کے ساتھ یہ سبیل بھی گئی۔ شہر کی باقی سبیلیں بھی گئیں اور یہ مصرعہ بھی گیا

''پانی پیو یہ نعمت رب جلیل ہے۔''

سبیل تو روایتی شہر کی نشانی تھی۔ نئے کمرشلائزڈ شہر میں سبیل یعنی پانی مفت' پیاسوں کو پانی پلاؤ اور ثواب کماؤ' پیسہ نہیں ثواب۔ یہ تو انمل بے جوڑ چیز تھی۔ سو سبیل کا باب اب بند ہونا ہی تھا۔

سبیل ختم۔ اب کوکا کولا کے سٹال شہر میں پھیلتے جا رہے تھے۔ کوکا کولا تیزی سے آیا' تیزی سے نئے سے پرانا ہوا۔ جب نیا پرانا ہو گیا تو اس کی برادری سے نئے نئے مشروبوں کی نمود ہوئی۔ ہر مشروب نے چندے خوب چمک دکھائی۔ چمک اک ذرا ماند ہوئی تو دوسرا مشروب آن موجود ہوا۔ سیون اپ' ٹیم' پیپسی' ان سب کو کوکا کولا ہی کی آل اولاد سمجھو۔

پہلے نئے مشروب آئے۔ پھر نئی نئی غذائی اشیاء آئیں۔ برگر آیا' پیزا آیا' زبان کا ذائقہ پینے اور کھانے دونوں ہی معاملوں میں ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ اس پر مجھے ابن انشاء یاد آ گیا۔ پہلے تو میں نے اسے ترقی پسند شاعر کے طور پر جانا تھا۔ سو میرے حسابوں

جیسے اور ترقی پسند شاعر ویسے ابن انشاء بھی ایک ترقی پسند شاعر اور آدمی بھی جیسے اور ترقی پسند ویسے وہ۔ یہ تو رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ شاعر بھی تھوڑی اور طرح کا ہے اور آدمی بھی تھوڑی اور طرح کا۔ ویسے ہماری افہام و تفہیم شعر و ادب کے دائرے سے نکل کر ہوئی۔ رنگا رنگ' خوانچوں کے بیچ ہم نے ایک دوسرے کو جانا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور دھیان میں لاتا ہوں کہ آغاز کس خوانچے سے ہوا تھا۔ شاید گول گپے کے خوانچے سے۔ شاید یوں ہوا تھا کہ میں ان ذائقوں کو یاد کر رہا تھا جن سے میں ہجرت کے طفیل محروم ہوا۔ ابن انشاء سنتا رہا' پھر بولا ''تم نے لاہور میں کبھی گول گپے کھائے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے پانی کے بتاشے''

''ہاں ہم انہیں گول گپے کہتے ہیں۔ تو میرٹھ ہاپوڑ میں تم نے پانی کے بتاشے بہت کھائے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں یہاں کے گول گپے کھلاتا ہوں۔''

ٹی ہاؤس سے اٹھ کر ابن انشاء کے ساتھ چلتا ہوا میں مال کے اس نکڑ پر پہنچا جہاں اب الفلاح کی اونچی عمارت کھڑی ہے۔ تب یہاں یہ عمارت نہیں تھی۔ ایک گھنا پیپل کا پیڑ تھا اور کھلی ہوئی جگہ۔ یہاں ایک گول گپے والے نے اپنا خوانچہ سجا رکھا تھا۔ یہاں ابن انشاء کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے گول گپے کھائے اور مطمئن واپس ہوا۔ پہلی مرتبہ میں نے اپنے آپ کو ایک ترقی پسند ادیب کے ساتھ متفق الرائے محسوس کیا۔

زبان کا ذائقہ شاید آدمی کے انداز نظر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سو مجھے جلدی ہی پتہ چل گیا کہ ابن انشاء ترقی پسند ادیب ہوا کرے مگر ہم ادب سے باہر چیزوں کو ایک ہی طرح سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح سے جسے ترقی پسندوں کے محاورے میں زوال پسندی کہتے ہیں۔ سو جب 1953ء کے مقامی مارشل لاء میں صفائی کی مہم چلی اور لاہور شہر کی سڑکیں خوانچوں سے پاک صاف ہوتی چلی گئیں تو میں نے ابن انشاء کو کہ اب کراچی جا چکا تھا' اس واقعہ سے مطلع کیا۔ اب میں وہ خط پڑھتا ہوں جو ابن انشاء نے جواب میں لکھا تھا۔

''جان من۔ میں آج بہت دنوں کے بعد دفتر آیا ہوں۔ دفتر آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ تمہارے خط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ لاہور کی قدر تم ہی نے پہچانی ہے۔ لاہور سے کوئی درویش یہاں آتا تھا تو میں اس سے یہی پوچھتا تھا کہ بھائی لاہور کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب' اس کا کیا حال ہوا۔ وہ خوانچوں والے کہاں گئے۔ شب گردی کرنے والے ادارہ مزاجوں کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ چھولوں اور کلچوں والوں کا بازار تو مارشل لاء نے سرد کر دیا ہوگا۔ سینماؤں کا بھیڑ بھیڑکا' قلفیوں

والوں کی آوازیں' تانگوں والوں کی تانیں' چائے خانوں کی رات گئے کی محفلیں' یہ سارا شیرازہ بکھر گیا ہوگا تو لوگ آخر وہاں سانس کیسے لیتے ہوں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ جو آیا اسے لاہور کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ اس نے سڑکوں کی صفائی' لوگوں کے نظم وضبط اور دودھ دہی کی ارزانی کا حال ہی سنایا۔ میں اب سوچتا ہوں۔ میں نے غلط آدمیوں سے لاہور کا مزاج پوچھا۔ پیارے یہ لاہور کی تباہی بہت بڑا موضوع ہے۔ یہ ایک شہر آشوب کا موضوع ہے..... میرا مذاق Decadent سہی لیکن میں نے مدت ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور اب بڑے مزے سے گزرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہمی' ادہام پرست' خبطی' سنکی' ازادہ رووارستہ مزاج میں ہمیشہ سے تھا.....''

خیر یہ دور جلدی گزر گیا۔ گئے ہوئے خوانچے واپس آ گئے اور جب انشاء لاہور آیا تو ہم نے چیئرنگ کراس جا کر اسی نکڑ پہ سیر ہو کر گول گپے کھائے اور اب دستور یہ ہوا کہ انشاء کا جب لاہور کا پھیرا ہوتا' شام کو ٹی ہاؤس سے مجھے اکھاڑنا' اسی نکڑ پر پہنچنا اور گول گپے کھانا۔

یہ دستور لمبا نہیں کھینچ سکا۔ مارشل لاء کے زمانے میں مال روڈ کو صفائی کی جو ہوا لگی تھی' وہ بے اثر تو نہیں جا سکتی تھی۔ لاہور ترقی کرتا چلا جا رہا تھا اور پرانے ذائقوں والے خوانچے مختلف سڑکوں کے نکڑوں سے غائب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر چیئرنگ کراس کے نکڑ پہ سجے گول گپوں کے خوانچے کی بھی باری آ گئی۔ یہاں اب ایک فلک بوس عمارت کی نیو پڑ رہی تھی۔ گول گپوں کے خوانچے کو رخصت ہونا ہی تھا۔

وہ گرمیوں کی شام تھی۔ ابن انشاء کے آنے پر میں ٹی ہاؤس سے اس کے ساتھ نکلا لیکن مال پہ چہل قدمی بے معنی نظر آ رہی تھی کہ اب وہ خوانچہ بڑھ چکا تھا جو اس سڑک پر ہماری منزل مقصود ہوا کرتی تھی۔

انشاء نے چلتے چلتے کہا ''یار پیاس لگ رہی ہے۔''

''پھر کوکا کولا پئیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔''

''نہیں میں کوکا کولا نہیں پیا کرتا۔ ان نئے Drinks میں مجھے مزا نہیں آتا۔''

''مزا تو مجھے بھی نہیں آتا مگر اور کیا پئیں۔ ستو کا مٹکا اس سڑک سے اٹھ چکا ہے۔ تخم بالنگے کے شربت والا بھی اب ریگل چوک میں نظر نہیں آتا۔''

''تم نے شربت بادام پیا ہے؟''

''نہیں۔''

''چلو میں تمہیں پلاتا ہوں۔''

ہم دونوں مال سے مڑے اور بیڈن روڈ سے ہوتے ہوئے میکلوڈ روڈ پر آ گئے۔

''یہ دکان ہے۔ یہاں شربت بادام لاجواب ہوتا ہے۔''

میں نے شربت بادام پیا اور انشا پر داد کے ڈونگرے برسائے کہ کیا دکان دریافت کی ہے۔ پھر یہ دستور ٹھہرا کہ گرمیوں کے دنوں میں جب انشاء کا پھیرا لاہور کا لگتا تو رات کو واپسی میں انشاء کا ساتھ میں میکلوڈ روڈ کے اس نکڑ تک دیتا جہاں شربتوں کی یہ دکان تھی۔ انشاء شربت بادام ایک گلاس پلا کر مجھے رخصت کرتا۔

''یار بات یہ ہے کہ میں دیہات کا آدمی ہوں۔ ذائقہ بھی میرا وہی ہے۔ ساگ' مکئی کی روٹی' لسی اسی قسم کی چیزیں جو دیہات میں استعمال ہوتی ہیں' مجھے اچھی لگتی ہیں۔ نئی شہری غذاؤں میں مجھے لذت نہیں ملتی۔''

یاروں نے گھر بیٹھے بیٹھے اپنے شہروں میں اپنے قصبوں میں رہتے ہوئے اپنے ذائقے بدل لیے اور باہر سے آئی ہوئی لذتوں کے لیے پسند پیدا کر لی۔ ابن انشاء نے دنیا جہاں کی خاک چھان ڈالی۔ مشرق اور مغرب کے ملکوں کے سفر کیے' وہاں کی ڈشیں چکھیں لیکن ذائقہ وہی دیہاتی رہا۔

ذائقہ کے معاملہ میں چونکہ میں بھی خالص دیسی آدمی ہوں' اس لیے ابن انشاء سے اس سطح پر میرا بہت جلدی اتحاد ہو گیا مگر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ایک اور ذائقہ بھی ہمارے درمیان مشترک ہے۔ لفظوں کا ذائقہ۔ اس ذائقہ کے معاملہ میں بھی ان انشاء بالکل دیسی آدمی تھا۔ وہی دیسی قسم کی نثر جو میر امن نے لکھی تھی یا مولانا محمد حسین آزاد نے یا سرشار نے ابن انشاء کو متاثر کرتی تھی۔ لہجے اور لفظ لیتا تھا جتنی گول گپے کھا کر یا شربت بادام پی کر لیتا تھا۔ بس اسی ذائقہ نے اسے ہمارے زمانے کا صاحب طرز نثر نگار بنا دیا۔

اردو صحافت میں نثر کا باب مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ ابن انشاء نے اسے پھر کھول دیا اور ایسے کھولا کہ یہ باب پچھلے باب سے کسی صورت ٹیا دکھائی نہیں دیتا۔ نثر کیا خوب لکھی مگر زیادہ اخبار میں لکھی۔ شاید ابن انشاء کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی نثر اس کی شاعری کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو جائے۔ ایک گفتگو میں کہا کہ ''کالم نگاری میری ازدواجی زندگی ہے۔ شاعری میرا عشق ہے۔ ''تو ابن انشاء کی کوشش ہی نظر آتی ہے کہ بیوی اور محبوبہ الگ الگ رہیں۔ ایک کا سایہ دوسری پر نہ پڑے۔ سو بقول خود ''کبھی سنجیدہ نثر نہیں لکھی اور کبھی مزاحیہ شعر نہیں کہا۔''

نثر نگار ابن انشاء ایک ہنستا مسکراتا شخص تھا۔ شاعر ابن انشاء جوگ پر مائل ایک اداس روح۔ ترقی پسندی کا رنگ جوں جوں چھٹتا گیا' جوگ پر مائل اس اداس روح کی اداسی گہری ہوتی گئی مگر عجب اداس روح تھی۔ بس شاعری میں اپنے درشن کراتی تھی۔ ویسے اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ نہ اس کی نثر میں نہ اس کی بات چیت میں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ میری دلچسپی کی چیزیں تین ہیں۔ شرلک ہومز' کھانا اور سونا اور اب تم پوچھو گے کہ تمہارا آخر نظریہ حیات کیا ہے۔

چلو پوچھ لیا' پھر بتا دو۔

جواب دیا' میرا نظریہ حیات ہے۔ آرام' اول آرام اور بعد میں بھی آرام۔ اس لیے میں سونا پسند کرتا ہوں اور اس کا قائل ہوں کہ آنے والے کل میں جو تمہیں کرنا ہے' اسے آج پر مت ٹالو۔

تو موصوف کو سونے سے بہت دلچسپی تھی' وہ اپنے نظریہ حیات کے واسطے سے تھی اور کھانے سے رغبت۔ کہنے لگا کہ میرا ذائقہ بالکل دیہاتی ہے۔ جس طرح جاہل اپنی جہالت میں مگن رہتا ہے۔ میں اپنے دیہاتی ذائقہ میں مگن ہوں۔

مگر اب ہمارے ذائقے ایک انقلاب سے دوچار ہیں۔ پہلے کوکا کلچر آیا اور ہمارے رنگا رنگ شربتوں کو' ستوؤں کو' لسی کو بہا کر لے گیا۔ اب پیزا کلچر کی نمود ہے۔ گزرے زمانے کی ایک مثل یاد آئی۔ رام نے ایک بیٹا دیا' وہ بھی مسلمان کا۔ پوری کچوری کھاتا نہیں۔ ٹکڑا مانگے نان کا..... یہ ان نئے نویلے ہندو نوجوانوں کا احوال ہے جو اپنے روایتی کھانوں سے بیزار تھے اور مغلئی دسترخوان پر لہلوٹ تھے۔ کم وبیش یہی صورت احوال اب پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے۔ نئی تانتی' نئے ذائقوں پر رچی ہوئی ہے۔ ہمارے سارے مغلئی غیر مغلئی پنجابی' پشاوری کھانے ایک طرف اور پیزا دوسری طرف۔ پیزا ہٹ کھلتے چلے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان میں میکڈانلڈ آن پہنچا ہے۔ کھانوں کی پرانی تہذیب کو سلام' اب فاسٹ فوڈ کلچر کی نمود ہے۔ روایتی شہر اب اپنے آخری دموں پر ہے۔ میں گھر میں بند بیٹھا ہوں۔ میرے گھر کے باہر جیل روڈ پر پھاوڑا بج رہا ہے' کلہاڑا چل رہا ہے۔ پرانی سڑک کھد رہی ہے۔ نئی شاہراہ کا ڈول پڑ رہا ہے۔ درخت کاٹے جا رہے ہیں۔ پرندے کتنے اس نواح سے اڑ گئے۔ کتنے اڑ جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ کچھ وضع دار چڑیاں ہیں جو پرانی وضع کو نبھا رہی ہیں۔ صبح ہی صبح نمودار ہوتی ہیں۔ توس کے تھوڑے ریزے جو میں پیش کر سکتا ہوں کر دیتا ہوں۔ وہ چگتی ہیں' تھوڑا چوں چوں کرتی ہیں۔ پھر جلدی ہی پھر کر کے اڑ جاتی ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ یہ چڑیاں اس وضع کو کب تک بناتی ہیں۔

مجھے دیکھو کہ میں اس نئے ابھرتے نقشہ میں پرانے چائے خانوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں اور ان یاروں کو جو یہاں بیٹھ کر دنیا و مافیا

سے بے تعلق ہو جاتے تھے۔ کھانا کھایا' کھایا نہ کھایا مگر چائے کا دور جاری رہنا چاہیے۔ جب کسی چائے خانے کا پتہ نشان نہیں ملتا تو گھوم پھر کر ٹی ہاؤس' کم از کم اس زمانے کا ایک نشان تو باقی ہے۔ یاد فراق محبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کہ بس ٹمٹمار ہی ہے

''وہی نقشہ ہے دل اس قدر آباد نہیں''

اتنا بھی غنیمت ہے۔ اکا دکا دیوانہ اب بھی نظر آ ہی جاتا ہے۔ ایک آدھ سچ مچ کا پاگل بھی ہاں اس زمانے میں زیادہ ہوتے تھے۔ سچ مچ کے پاگل بھی زیادہ نظر آتے تھے۔ ایک کو تو ہم نے اپنی نظروں کے سامنے پاگل دیوانہ ہوتے دیکھا۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اچھے بھلے آدمی تھے۔ اچھی بھلی غزل کہتے تھے۔ ایک دو کام کی کتابوں کے ترجمے بھی کر رکھے تھے۔ توزک جہانگیری کا ترجمہ تو مجھے اب تک یاد ہے۔ اچھا کیا تھا۔ اپنے کلینک سے فارغ ہو کر ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شب ٹی ہاؤس پہنچتے تھے جس پر انجم رومانی نے کچھ شعر بھی کہے تھے۔ آغاز یوں ہوتا تھا

''آتا ہے ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر سلیم''

عارف عبدالمتین کے ساتھ یارانہ تھا۔ انہیں کے ساتھ چائے پیتے اور بحث کرتے نظر آتے تھے۔ بس دیکھتے دیکھتے دماغ چل بچل ہو گیا اور ایسا چل بچل ہوا کہ ٹی ہاؤس چھوڑا' ٹی ہاؤس والوں کو چھوڑا۔ سب سے متنفر دور دور ہراساں و پریشاں پھرتے تھے۔ سب پر شک کہ سی آئی ڈی والے ہیں اور میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات گئے جب ہم چلتے چلتے مال سے دور کے کسی کوچے میں جا نکلتے تو اچانک کسی موڑ پر کہیں قریب سے ایک غصیلی آواز سنائی دیتی' سالے خفیہ والے اور اس کے ساتھ ایک مغلظ گالی۔ انہیں گمان گزرتا کہ ہم انہیں کا پیچھا کرتے کرتے اس کوچے میں آئے ہیں۔ پھر ایک دن کوچے سے گزرتے ہوئے عجب منظر دیکھا۔ کیا دیکھا کہ تالیاں بجاتے قہقہے لگاتے' لڑکوں کا ایک غول ڈاکٹر سلیم کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اچانک انہوں نے ایک اینٹ اٹھائی اور پلٹ کر مغلظ گالیاں دیتے ہوئے اینٹ کھینچ کر ان کی طرف پھینکی۔ لڑکے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اب لڑکے آگے آگے بھاگ رہے تھے اور ڈاکٹر سلیم اینٹ لیے ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

ان دنوں ٹی ہاؤس کے عین سامنے پیپل کے پیڑ تلے ایک نلکا تھا۔ ایک پاگل مال کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے نل کو دیکھ کر ٹھٹکتا۔ پانی پیتا' اپنے سفید بگلا تہمد اور کرتے پر پڑی ہوئی اصلی یا فرضی چھینٹ کو محنت سے دھوتا۔ اس پاگل کو صفائی اور پاکیزگی کا خبط تھا۔ جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرتا۔ جو بھی ادیب نظر آتا' اس کا منہ چڑاتا اور بڑبڑاتا ہوا تیزی سے آگے چلا جاتا۔

انہیں برسوں کا ذکر ہے کہ ایک سفید فام لڑکی کاٹی ہاؤس میں ورود ہوا۔ حسین مہ جبیں مگر پٹڑی سے اتری ہوئی ایک بڑی سی گٹھڑی کمر پر لادے کوچہ کوچہ ماری پھرتی۔ تھکی ہاری ٹی ہاؤس میں داخل ہوتی۔ گٹھڑی کمر سے اتار کر میز پر رکھتی اور چائے کا آرڈر دیتی۔ چائے پیتی' پھر گٹھڑی کاندھے پر لاد کر ٹی ہاؤس سے اٹھتی اور آگے نکل جاتی۔

اب یہاں ایک کھسکے ہوئے جنٹلمین دیکھے جاتے ہیں۔ جون' جولائی کی سخت گرمی میں گرم سوٹ پہنے ہیٹ لگائے وارد ہوتے ہیں۔ ایک بڑا سا سوٹ کیس ساتھ میں ہوتا ہے۔ چائے پی' ویٹر سے تبادلہ خیال کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک ہیں جنہوں نے یہاں مستقل چھاؤنی چھائی ہے۔ لمبے لگ لگ' بدن چرخ ایسا کہ ہڈی ہڈی گن لو۔ گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے ہر سمے ہر موسم سوٹ میں ملبوس۔ نہ کسی سے بولنا بات کرنا نہ کسی کی طرف دیکھنا۔ اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں۔ جانے دیار امریکہ میں کیسی گھڑی میں اس فرنگن نے جس سے عمر بھر کا پیمان وفا باندھا تھا۔ کنارہ کیا کہ پھر دل کو کسی گھڑی صورت قرار نہیں آیا۔ اب اس کے خیال میں بیٹھے لکیر پیٹتے ہیں اور امریکہ کے صدر کے نام عرض داشتیں لکھتے ہیں اور انصاف مانگتے ہیں۔ عرض داشتیں بھیجتے' زمانہ گزر گیا۔ ادھر سے جواب آج تک نہیں آیا۔

تو جو تھوڑا بہت پیسہ کہیں سے ملتا ہے' وہ ڈاک میں صرف ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا ٹی ہاؤس کے ذمے ہے۔ اس انتظام میں بس ایک ہی دفعہ کھنڈت پڑی تھی۔ موصوف کو چپ بیٹھے بیٹھے خفقان ہوا تو بولنا شروع کر دیا۔ زبان جب کھلی تو ایسی کھلی کہ ٹی ہاؤس کی انتظامیہ کو بیروں کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ بیروں نے جواب میں کھانے کے وقت آنکھیں دکھائیں۔ ایک وقت کا کھانا نہ ملا تو دیوانے نے ہوش پکڑا۔ پھر کبھی زبان نہیں کھولی۔ کھانے کے وقت کھانا' چائے کے وقت چائے۔ خفقان ہوا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ جدھر منہ اٹھا نکل گئے۔ کوچہ گردی سے تھک گئے تو پھر اپنی تھان پر آن بیٹھے۔

ایک مراقی کر ڈکشنری کے مطالعہ کا مراق ہے۔ چائے سامنے رکھی ہے اور ویبسٹر ڈکشنری کھلی ہے۔ کس عرق ریزی کے ساتھ اس ڈکشنری کا مطالعہ کیا۔ سال ڈیڑھ سال میں جب ایک ایک لفظ کے معنی پڑھ لیے تو پھر دوسری ڈکشنری سنبھال لی۔ اب آکسفورڈ ڈکشنری زیر مطالعہ ہے۔

باقی رہی یہاں آنے والی ادبی مخلوق تو وہ ٹولیاں جن کے واسطے سے ٹی ہاؤس آگے جانا جاتا تھا' اب کہاں۔ کیسی کیسی ٹولی آئی اور ہنس بول کر چلی گئی۔ کیا کیا صورت تھی کہ یہاں نمودار ہوئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کتنی خاک کی تہہ میں چلی گئیں۔ کتنی اس رنگ سے بدلیں کہ اب پہچانی نہیں جاتیں۔ اب اور ٹولیاں ہیں اور ان کے لچھن ہیں۔ رنگ رنگ کے شاعر' رنگ رنگ کے افسانہ نگار'

ناول نگار۔ جتنے شاعر ہیں' سب صاحب دیوان ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ ان کے دیوانوں کی گنتی گنو تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گنی جائیں اور ان کی گنتی پوری نہ ہو اور افسانہ نگار ناول نگار ایسے کہ دونوں بغلوں میں مجموعے دبے ہوئے جو سامنے آیا' اسے ایک عدد مجموعہ نذر کر دیا۔ وہ زمانہ گیا جب نوخیز لکھنے والے جھجکتے ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے تھے۔ پھر کوئی کسی بڑے کی انگلی پکڑ کر حلقہ ارباب ذوق میں پہنچتا۔ رفتہ رفتہ وہ دن آتا کہ اس کی تحریر کسی بھلے ادبی رسالے میں جگہ پاتی۔ اس زمانے کے رسالے کے ایڈیٹر بھی تو سخت گیر ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ جو تحریر موصول ہوئی' آنکھیں بند کر کے چھاپ دی۔ یہ تو تب ہوتا ہے جب رسالہ کی بڑائی اس میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ ضخیم ہو۔ رسالہ میں چھپنے کے بعد بھی لکھنے والے کو کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ تب کتاب چھپتی تھی۔ مطلب یہ کہ قطرے پہ گہر ہونے تک کتنی کچھ گزر جاتی تھی۔ اب قطرہ راتوں رات گہر بنتا ہے۔ راتوں رات صاحب تصنیف۔ ٹی ہاؤس میں اتوار بھنڈار کھلتا ہے۔ توشہ بنتا ہے۔ یار لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں۔ شعر و افسانے کے نئے مجموعے بغل میں داب کر لوٹتے ہیں۔ ایک اتوار کی شام میں نے یہاں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اس شان سے داخل ہوئے کہ پیچھے پیچھے ایک ملازم جس کے سر پہ ایک گٹھر تھا۔ انہوں نے ایک خالی میز دیکھ کر گٹھر وہاں رکھوایا اور کھولا۔ پتہ چلا کہ یہ کتابوں کا گٹھر تھا۔ ہر میز پر جا کر وہاں بیٹھے ہوؤں کو ایک ایک کتاب نذر کی۔ جب ساری کتابیں بٹ گئیں تو اطمینان سے واپس چلے گئے۔

ایک ادیب شہر۔ ٹی ہاؤس کی پرانی ہڈی' چھٹی دہائی کا اینگری ینگ مین۔ جوانی ڈھل گئی۔ غصہ برقرار ہے۔ مہینے کے مہینے انگارے اگلتے ہیں۔ ایک رسالہ میں ملفوف کر کے ٹی ہاؤس میں تقسیم کر جاتے ہیں۔ یہ مہینے کی پہلی اتوار کا پروگرام ہے۔ اگلی اتوار کو اپنی نئی شاعری کا مجموعہ چھاپ کر لاتے ہیں اور تقسیم کر جاتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے نیا ناول لے کر آتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے کسی مغرب کے شاہکار کا ترجمہ۔ انتھک لکھتے ہیں۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

اچھا برا موٹا باریک پیسے چلے جاتے ہیں۔ نیکی کر کر کے منوں ٹنوں کے حساب سے دریا میں ڈال چکے ہیں۔

ایک بی بی اتوار کی اتوار نمودار ہوتی ہیں۔ خاموشی سے تھوڑا وقت بیٹھیں چائے خود پی' دوسروں کو پلائی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ ندرت الطاف ہیں۔ نام خدا جب جوان تھیں تو کافی ہاؤس میں بیٹھتی تھیں۔ شہر میں ان کی دھوم تھی۔ میں نے انہیں ایک کھیل میں دیکھا تھا' کیا چٹاخ پٹاخ بولتی تھیں۔ شباب کمبخت شتابی سے آیا۔ شتابی سے گیا۔ اسی رو میں وہ کافی ہاؤس سے نکلیں اور دور دیس نکل گئیں۔

واپس آئیں تو دیکھا کہ کافی ہاؤس بند ہو چکا ہے۔ ٹی ہاؤس کا رخ کیا۔ بس پھر یہیں کی ہو رہیں۔ کافی ہاؤس کے اکثر اجڑے ہوؤں کو ٹی ہاؤس ہی نے سینے سے لگایا تھا۔ انہیں بھی سینے سے لگالیا۔ دھوپ تو ساری چلی گئی۔ دیوار گلستان پر اس کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا۔ اس بھلے سمے کے ساتھی بھی چڑیوں کی طرح اڑ گئے۔ اب ٹی ہاؤس کی ایک میز سے نباہ کر رہی ہیں۔ کبھی کبھار افسانہ لکھتی ہیں اور اچھا لکھتی ہیں۔

اور لیجئے ایک بزرگ آتے ہیں' حاتم طائی کی صورت۔ سرخ وسفید' بھاری بھرکم' چھڑی ٹیکتے داخل ہوتے ہیں۔ یار انہیں دور ہی سے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے اپنے بل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ اے جی جوش ہیں۔ خوب آدمی ہیں۔ با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

''تلسی کھڑے بجار میں مانگیں سب کی کھیر''

اے جی جوش کا بجار ٹی ہاؤس ہے۔ ایک ایک میز پر جانا' تھوڑا بیٹھنا۔ پھر اگلی میز کا رخ کرنا۔ جس میز پر دم بھر کے لیے ٹک گئے' اس پر جتنی چائے پی گئی ہے' اسے ان کے حساب میں شامل سمجھو۔ ویسے فیاضی کی داستان ٹی ہاؤس سے آگے بھی چلتی ہے۔ دعوتوں کا اہتمام ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ یار کھا کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔

اور وہ جو دیوار سے متصل نشست سے چپکے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ چھریرا بدن' کمر قدرے جھکی ہوئی۔ جانے کب سے یہاں جمے بیٹھے ہیں۔ میں کتنے زمانے سے انہیں اسی نشست پر اسی انداز سے بیٹھا دیکھتا آ رہا ہوں۔ شاید اتنے زمانے سے بیٹھے بیٹھے انہیں تھوڑی پھپھوندی بھی لگ گئی ہو۔ یہ اسرار زیدی ہیں' نہ منہ سے بولتے ہیں' نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ پھر بھی ان میں کوئی جادو تو ہے کہ عقیدت مند دور دور سے کھینچ کر ان کے پاس پہنچتے ہیں۔ ان کی ٹیبل سمجھو تو آستانہ عالیہ ہے۔ بندگان درگاہ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر پہلے اس آستانے پر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ پھر جس کا جو مشغلہ ہے' اس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں جسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں' اسے حلقہ میں اقتدار مل جاتا ہے۔ اسی لیے حلقہ کے الیکشن کے دنوں میں ان کے گرد زیادہ جمگھٹا رہتا ہے۔

حلقہ ہنوز سانس لے رہا ہے۔ اور جب تک سانس تب تک آس۔ آسوں مرادوں والے اب بھی اس کے الیکشن میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ بلکہ اب زیادہ سرگرمی سے لیتے ہیں۔ تحریکوں اور انجمنوں کی بھی اپنی اپنی عمر ہوتی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین خوش قسمت تھی کہ بوڑھی ہونے سے پہلے گزر گئی۔ اب وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ حلقہ بدقسمت ہے کہ اسے یاروں نے مرنے نہیں دیا اور وہ ہنوز اس شرف سے محروم ہے۔ اب اس کا بسیرا بھی ٹی ہاؤس ہی میں۔

اور یہ جو عین وسط کی میز پر ایک شخص اٹنگا سا پائجامہ اور قمیص پہنے اکیلا بیٹھا ہے اور آنکھوں سے کتاب لگا رکھی ہے۔ وہ بھلا زاہد ڈار کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ سخت اکل کھرا۔ گنے چنے دوستوں کے سوا کوئی مخلوق میز پر آن بیٹھے تو اسے فوراً اٹھا دیتا ہے۔ وہ نہ اٹھے تو (ٹی ہاؤس میں یہ ڈھٹائی بھی چلتی ہے) خود اٹھ جاتا ہے۔ باہر جا کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ کب وہ میز سے ٹلے اور واپس جا کر اپنی نشست سنبھالے۔ مگر لازم نہیں کہ وہ اجنبی ہو۔ کسی دوست پر بھی کسی دن یہ وقت آ سکتا ہے۔ دوستوں میں وہ کوئی کوئی ہے جو اس کے لیے بار ہوں' مہینے قابل قبول رہتا ہے۔ سو دوست بھی باری باری پر سونا نان گریٹا کی حیثیت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ کوئی اجنبی اچانک دوست بن سکتا ہے اور اچانک کسی دوست کو اس میز سے دیس نکالا مل سکتا ہے۔ سو اس میز پر چھنٹ چھنٹا کر یہی کوئی تین ساڑھے تین نگ رہ گئے ہیں۔ مسعود اشعر' اکرام اللہ' شاہد حمید اور وہ بھی روزانہ نہیں اتوار کی اتوار پھیرا لگاتے ہیں۔ ہاں لڑکیوں کے لیے اس میز پر بہت جگہ۔ اور پتہ نہیں لڑکیوں کو زاہد ڈار میں کیا نظر آتی ہیں کہ جس نے اس سے ایک مرتبہ بات کر لی۔ پھر وہ بار بار اس طرف کا رخ کرتی ہے۔ مگر پھر اچانک غائب بھی ہو جاتی ہے۔ باقیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس سے کب فرنٹ ہو جائے۔

''تم تو اس سے بہت گھلے ملے نظر آتے تھے۔ اب اچانک وہ کیوں راندہ درگاہ بن گیا۔'' میں پوچھتا ہوں۔

''بہت اونچی آواز میں بولتا ہے۔ اس کی آواز مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''مگر وہ تو پہلے بھی اونچی ہی آواز میں بولتا تھا۔''

''اب زیادہ اونچی آواز میں بولتا ہے۔''

''تم یہ نہیں کر سکتے۔'' ایک روز میں نے تجویز پیش کی کہ ''ٹی ہاؤس آنے کی بجائے جنگل کا رخ کرو اور کسی برگد کے سائے میں جا بیٹھو۔ وہاں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ یکسوئی سے کتاب پڑھ سکو گے۔''

''ایسا ہی کرتا مگر یہ گوتم بدھ کا زمانہ نہیں ہے۔ دوسرے ہی دن پولیس مجھے را کا ایجنٹ بتا کر پکڑ لے جائے گی۔''

''مگر ٹی ہاؤس تم کس خوشی میں آتے ہو' تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہاں ادب کے نام پر ہر رنگ کا جناور آ کر گرتا ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے یہاں کس بھلے آدمی کو یکسوئی میسر آ سکتی ہے۔''

''میں یہاں خاموشی کی تلاش میں آتا ہوں۔''

خاموشی کی تلاش ٹی ہاؤس میں؟ میں حیرانی سے اسے دیکھتا ہوں۔ مجھے حیران ہونا چاہیے۔ مال روڈ کا یہ ٹکڑ جہاں ٹی ہاؤس واقع

ہے مال روڈ کے سب سے پر شور ٹکڑوں میں سے ہے باہر بھی شور اور اندر تو شور ہوتا ہی ہے اور ضیاء الحق کے زمانے سے اس کے شور میں ایک اور قسم کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں یاروں کو جب جلسہ کرنے اور دل کا غبار نکالنے کے لیے کہیں جگہ نہ ملتی تھی تو ٹی ہاؤس آ کر اس کی بالائی منزل میں جلسہ کرتے تھے۔ یوم مئی کا دانشوروں کا جلسہ سال کے سال یہیں ہوا کرتا تھا۔ تب سے ٹی ہاؤس جلسہ گاہ بھی ہے۔ کسی بھی شام یہاں جلسہ کرنے والوں کا بھیڑ بھڑکا نظر آ سکتا ہے۔ حلقہ کا جلسہ بھی اب یہیں ہونے لگا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ''تم باؤلے ہو گئے ہو۔ ٹی ہاؤس میں تمہیں خاموشی کہاں مل جائے گی۔''

مگر زاہد ڈار کی منطق یہ ہے کہ ہر شور کے وسط میں ایک خاموشی کا منطقہ ہوتا ہے۔ سو وہ روز دن ڈھلے گھر سے پیدل چل کر مال کی ٹریفک کے بے ہنگم شور سے گزر کر ٹی ہاؤس پہنچتا ہے اور عین وسط کی میز سنبھال کر سمجھتا ہے کہ وہ خاموشی کے منطقہ میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر کتاب کھولتا ہے اور اردگرد کے شور سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لے دے کے کتاب پڑھنا ہی اس کی مصروفیت ہے۔ اسی کے زور پر وہ اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین آدمی تصور کرتا ہے۔ ضحاک کے کاندھوں پر دو سانپ پھنپھناتے رہتے تھے۔ روز صبح ان سانپوں کو دو انسانی کھوپڑیاں درکار ہوتی تھیں کہ یہی ان کی غذا تھی۔ یہ غذا نہ ملتی تو وہ ضحاک پر پھنکارتے تھے۔ زاہد ڈار کے کاندھوں پر بھی دو سانپ بیٹھے ہیں۔ انہیں غذا کے نام انسانی کھوپڑیوں سے نکلا ہوا وہ گودا درکار ہوتا ہے جسے کتاب کہتے ہیں۔ یہ سانپ اتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے اس سے شاعری چھڑوا دی۔ کہتا ہے کہ شاعری میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اگر میں شاعری کرتا رہتا تو بہت سی کتابیں پڑھنے سے رہ جاتیں۔ عمر تھوڑی ہے اور کتابیں پڑھنے کے لیے بہت ہیں۔ سو میں نے بہت سوچا کہ شاعری چھوڑ دو اور صرف کتابیں پڑھو۔

کتابیں بے شک بہت ہیں۔ زاہد ڈار کے لیے بہت سے بھی زیادہ ہیں۔ ساری کتابیں تو اللہ کا کوئی بندہ نہیں پڑھ سکتا۔ سو ہر کتب بیں کو پڑھنے کے لیے کتابوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ زاہد ڈار کم از کم اردو کی کتابوں کی حد تک کسی انتخاب کا قائل نہیں ہے۔ اچھی بری جو کتاب ہاتھ پڑ جائے' پڑھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ یار تم خراب کتابیں بھی اس ذوق وشوق سے پڑھتے ہو۔ ہر خراب کتاب دیکھ کر پہلے بیزاری کا اظہار کرتے ہو' پھر اسے پڑھ ڈالتے ہو۔

کیا کروں' پڑھنی پڑتی ہیں۔

کیا مجبوری ہے؟

اصل میں اردو کی خراب کتابیں آخر اردو ہی میں لکھی گئی ہیں تو مجھے پڑھنی پڑتی ہیں۔